ڈاکٹر خالد اقبال یاسر

ڈائریکٹر جنرل،اردو سائنس بورڈ،لاہور

اٹھارہ سو ستاون اور غالب کی عملیت پسندی

Dr. Khalid Iqbal Yasir

Director General, Urdu Science Board, Lahore

Revolt of 1857 and Ghalib's Pragmatic Attitude

Adaptability is an intrinsic characteristic of a human being. Ghalib as a genius had a tutelary spirit to deal with issues in the perspectives of their practical requirements and consequences. He treated the holocaust of the revolt of 1857 with reference to its practical lessons. His pragmatic attitude is reflected in his diary of the otherwise dreadful events of the revolt and its aftermath entitled 'Dastanbu', in absolete dialect of Persian language to avoid the shattering consequences.

'Dastanbu' is referred as a controversial account of the upheaval as compared to his letters which were written to his intimate friends during that critical times of Indo-Pak history.

He was compelled by the magnitude of the miseries and incarcerations to assure the revengeful British rulers of his loyalty to them.

He was particularly concerned about loss of identity and self-respect in the back drop of colossal loss of lives and property inflicted by ruthless and reckless conqurers of Delhi.

Instead of bowing before the storm, Ghalib took the circumstance as they unfolded before him which affected all walks of life of the society.

This paper is an attempt to bring forth the evidences and references to reflect pragmatic approach of Ghalib towards life in extremely volatile and hostile

conditions. In those trying moments, he avaluated assertions by their practical consequences and bearings to safeguard his own specified interests and yet succeeded in maintaining self-regard and cognitive consistency.

۱۸۵۷ء کی کشاکش کو غدر کہیں، جنگِ آزادی کہیں، بغاوت کہیں، شورش کہیں، انقلاب کہیں، یا کچھ اور، تاریخِ ہند کے اس اندوہناک سانحے کے بارے میں بہت کچھ سامنے آ چکا ہے۔ تاریخی لحاظ سے اخبارات، چھاپہ خانے اور بے تار برقی نے سب کچھ نہ سہی بہت کچھ محفوظ کر دیا تھا۔ خفیہ روزنامچوں، سرکاری وقائع نگاری، چشم دید رپورتاژوں، یادداشتوں، پروانوں، فرمانوں، پیاموں، خط کتابت وغیرہ کی من وعن اشاعتوں کے بعد تر جموں اور ان بنیادی ماخذات کے حوالوں سے اتنی متنوع کتابیں اور دیگر مواد سامنے آ چکا ہے کہ عام پڑھنے والا بھی انگریز، ہندو اور مسلمان مصنفین کے شخصی تضادات اور نفسیاتی کیفیات کے سبب غلط بیانی، تعصّب، مصلحت، ریاکاری اور مفاد پرستی میں دبے حقائق کا اپنی سمجھ بوجھ سے سراغ لگا سکتا ہے۔ یہ بہرحال طے ہے کہ انگریز کا نکتہ نظر سراسر استعماری تھا اور ہندوؤں اور مسلمانوں کا حریت پسندانہ، انگریز کے نزدیک یہ بغاوت تھی اور ہندوؤں مسلمانوں کے خیال میں جنگِ آزادی، معاملہ تخت یا تختے کا تھا اور تخت انگریزوں کے ہاتھ آیا تھا اور تختۂ دار حریت پسندوں کا مقدر بنا تھا۔ بہرحال انگریزوں کی کامیابی سے حریت پسندوں کا مؤقف غیر ملکی فاتحین کے مقابلے میں وقتی طور پر کمزور پڑ گیا تھا اور مسلم اور ہندو زعماء بھی حالات کے جبر کے تحت اپنی انفرادی اور اجتماعی بقا کی خاطر سچ کو سچ اور جھوٹ کو جھوٹ کہنے سے گریزاں تھے۔ خاص طور پر ایسے میں جب جون ۱۸۵۷ء کا جابرانہ پریس ایکٹ نافذ ہو جس کے تحت بغاوت کو جنگِ آزادی کہنا جرم ہو، اخبار باغیانہ مضامین کی اشاعت پر بند کیے جا رہے ہوں، چھاپہ خانوں پر تالے پڑ رہے ہوں تو خدا کو گواہ بنا کر ع کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے، کے دعوے ساتھ 'داروگیر سے خدا کی پناہ' چاہنے کے ساتھ ساتھ غالب نے بوجوہ 'انگریز ناخداؤں کی پناہ چاہی'' (۱) تو ایسا غالب نے اپنی سوچی سمجھی عملیت پسندی کی رو میں کیا ہوگا کیونکہ اصل کہانی تو اسے معلوم تھی مگر وہ اسے کہنے سے ڈرتا تھا جیسا کہ اس کے بہت سے خطوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ خواجہ منظور حسین نے بجا طور پر غالب کے 'دستنبو' لکھنے میں دو وجوہات 'ذاتی تحفظ' اور 'فروغِ مراتب' کی نشاندہی کی ہے۔ (۲) بلکہ غالب نے خود تفتہ کے نام ۱۸۵۸ء کے تیسرے جمعے کو لکھے گئے خط میں واضح کیا ہے کہ اس نے 'دستنبو' کو اپنے بہت سے مطالب کے حصول کا ذریعہ سمجھا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اس کتاب کی جلد سے جلد اشاعت کے لیے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ (۳) دستنبو کے ذریعے وہ چاہتا تھا کہ انگریزوں کی اس سے ناراضگی دور ہو اور وہ اس کے خاندانی پس منظر کو ملحوظ رکھتے ہوئے پہلے کی طرح اسے وہی مرتبہ اور مقام دیں جو اسے مغل بادشاہ کے دربار میں حاصل تھا۔ اسے برداشت نہ تھا کہ اس کے ساتھ معمولی ملازم کا سا سلوک ہو۔ حقائق بھی یہی ہیں کہ اس کا ادّعائے علم وفضیلت غلط نہ تھا اور اس کا احترام واجب تھا۔ توقیرِ ذات (Self-Regard) کا رویہ غالب کے ہاں معاشرے میں پہلے سے حاصل نمایاں مقام اور دربار میں دوسروں سے برتر مرتبہ پانے کے سبب قابلِ فہم ہے۔ خاص طور پر جب حال یہ ہے کہ مغل بادشاہ بھی انگریز کے وظیفہ خوار ہوں اور ان سے خوفزدہ بھی ہوں ؎

ان روزوں اس گلی میں جاسوس جابجا ہیں
کہہ دو کوئی ظفرؔ سے، واں آج کل نہ جاوے (بہادر شاہ ظفر)

تو غالب کا ۱۸۵۷ء سے بہت پہلے بھی اس بات کا ڈر غلط نہیں کہ اگر انگریز سرکار نے اس کی دادرسی نہ کی تو نہ جانے اس کا کیا حشر ہو۔ وکیل کی کمزور انگریزی میں متن یوں ہے:

" Should the Supreme Government not do some thing for me; What is to become of me?" (۴)

حقائق کے بارے میں منطقی حوالے سے عملیت پسندی کی تشریح اور جزئیات بطور فلسفہ غالب کی وفات کے بعد مغربی مفکرین کے ہاں بیان ہوئی تھیں۔ یہ معاملہ انیسویں صدی کی آٹھویں دہائی کا ہے جب امریکی دانشور سی۔ ایس۔ پیئرس (Charles Sanders Peirce) اور 'Ideas' اور 'شعور کی رو' والے ولیم جیمز (William James) کے درمیان مکالمے میں اس فلسفے کے ابتدائی خدوخال سامنے آئے اور انھوں نے تقریباً طے کیا کہ:

Pragmatism is "a method of logic, a method of determinings of intellectual concepts, that is of those upon which reasoning may hinge." (۵)

ادب میں اس نے کہیں بیسویں صدی کے شروع میں راہ پائی تھی تاہم عملیت ایک رویے کے طور پر انسانوں میں ہمیشہ سے موجود تھی۔ دراصل ایک خالص عملیت پسند کی طرح غالب نے اپنے عہد کی از حد ترقی یافتہ استعماری طاقت کے استبداد تلے سسکتے معاشرے میں اپنی بقا کی جدوجہد کی عملی تفسیر 'دستنبو' (طبع اوّل ۱۸۵۸ء) کی صورت میں ایک طرف اپنے انگریز آقاؤں کی خدمت میں بروقت اپنی صفائی پیش کی تھی اور دوسری طرف وہ اس اختلافی کتاب کے حوالے سے سچائی میں نجات ڈھونڈنے کا دعویٰ بھی کر رہے تھے۔ یعنی سی۔ ایس۔ پیئرس (1839-1914) کے فلسفۂ نتائجی عملیت (Pragmatism) کے مطابق نتائج وعواقب کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے ہاتھوں 'دستنبو' کی تصنیف کو درست اور اصولی قرار دے رہے تھے اور وہ اپنے اس خیال میں اتنے غلط بھی نہیں تھے کیونکہ ''یہ 'سراسر' انگریز حکام کی تائید وتحسین میں نہیں۔۔۔ ہر امر کی احتیاط اور ہر امر کا لحاظ رکھنے کے باوصف یہ بھی اس خونچکاں روداد سے خالی نہیں جو خطوں میں بیان ہوئی ہے۔'' (۶) چنانچہ غالب کو انگریز پرستی کا طعنہ دینے والے بھی حتمی طور پر یہ ماننے پر مجبور ہیں کہ ''مرزا کے متعلق یہ بات کہنا کہ وہ انگریزوں کا پٹھو تھا صحیح نہیں کیونکہ مرزا زمانہ شناس تھے۔ وقت کے بدلتے ہوئے تناظر میں انھوں نے یہی غنیمت جانا کہ اس بڑھتی ہوئی قوت کا مقابلہ کرنے کی بجائے مصلحتاً اس کے آگے ہتھیار ڈال دیا جائے۔'' (۷) تاریخ کی کروٹوں، اشخاص یا اشیاء کے بارے میں فراہم شدہ معلومات کی نوعیت، ان کے پس منظر، پیش منظر کے ادراک، ذاتی تجربے اور بصیرت سے انسان خود بھی بدلتا ہے اور دوسروں کو بھی بدلنے کی کوشش کرتا ہے یعنی وقوفی ناہمواری (Cognitive Dissonance) کو وقوفی ہمواری میں بدل کر زمانے کے لیے متوازن اور موزوں بناتا ہے۔ ایسی زمانہ شناسی اور مصلحت پسندی سے بڑھ کر، جو انفرادی ہی نہیں اجتماعی فلاح کا باعث بننے والی تھی، مثبت عملیت پسندی اور کیا ہو سکتی ہے۔ غالب کی اسی عملیت نے ولیم جیمز کے سادہ فلسفۂ عملیت کی طرح جو بے اصولی کو اپنا اصول قرار نہیں دیتی، سرسید احمد خان جیسے سیدھے اکل کھرے انسان کو نظری سطح پر قائل کر کے ملک وملّت کے معاملات میں رہنمائی کی طرف مائل کر دیا۔ غالب کی لکھی ہوئی آئینِ اکبری کی منظوم فارسی تقریظ سرسید نے ناراضگی کے عالم میں اپنی مرتبہ کتاب آئینِ اکبری میں شامل نہیں کی تھی لیکن بعد ازاں اسی سے متاثر ہو کر سرسیّد نے دورانِ غدر خدمات

کے صلے میں خطیر پنشن اور خلعت قبول کرنے سے انکار کرتے ہوئے رسالہ اسباب بغاوتِ ہند لکھا اور انگریزوں کے سامنے استدلالی اور عقلی طور پر مسلمانوں کی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ ایک مصلح کے طور پر انھوں نے سائنسی علوم کے فروغ کے لیے انجمنیں قائم کرنا بھی شروع کر دیں، علمی اور تاریخی کتب کے تراجم کا آغاز کیا اور غالب سے بھی بڑھ کر انگریزوں کے آئینی اقدامات، معاشرتی اصلاحات، علم و ہنر، نت نئی ایجادات کے فیوض کے اعتراف کے ساتھ ساتھ ان کی طرف مسلمانوں کو اخبارات و رسائل کے ذریعے راغب کرنے کی کوشش کی۔ ہم سب واقف ہیں کہ ان کے اصلاحی اقدامات کا نکتۂ عروج علی گڑھ کے مقام پر ایک مدرسے کا قیام تھا جو ان کی زندگی ہی میں کالج اور پھر یونیورسٹی بن گیا۔ غالب نے اپنی اس نتیجہ خیز اور اثر آفریں تقریظ میں انگریزوں کی ایجادات، بے تار برقی، بھاپ سے چلنے والی ریل، دیا سلائی اور دخانی جہاز کے علاوہ ان کے رموزِ حکمرانی اور علم و عدل کے امتزاج کی تعریف کی تھی اور سرسید احمد خان کو مردہ پروری کا طعنہ دیا تھا (۸) اور ان کا یہ طعنہ کام کر گیا تھا۔

مکتوبات بنام انوار الدولہ شفق (اکتوبر ۱۸۵۸ء)، چوہدری عبدالغفور سرور (۱۸ نومبر ۱۸۵۸ء) منشی ہرگوپال تفتہ (۱۷ اگست ۱۸۵۸ء) مرزا یوسف علی خان عزیز (۱۸۵۹ء) میر مہدی مجروح (۱۸ اگست ۱۸۵۸ء) نامعلوم (۱۸ جولائی ۱۸۵۸ء) منشی شونرائن آرام (اکتوبر ۱۸۵۸ء) کے علاوہ بھی کئی خطوط میں غالب نے 'دستنبو' کو بار بار سرکار کی فتح کا حال نہیں اپنی پندرہ مہینے کی سرگزشت کہا ہے۔ یعنی ایک طرف تو وہ 'دستنبو' کے ذریعے اس الزام بغاوت سے چھٹکارا پانا چاہتا تھا جو غلط یا صحیح طور پر اس پر عائد ہو چکا تھا، دوسرے وہ اپنی روزی بحال کرنے کا طلب گار بھی تھا۔ اسے احساس تھا کہ ''اہلِ دہلی عموماً بُرے ٹھہر گئے، یہ داغ ان کی جبینِ حال سے مٹ نہیں سکتا۔'' (۹) جبکہ غالب بذاتِ خود شورش کے دنوں میں قلعۂ معلّٰی جاتا رہا اور اس نے آگرہ کی فتح کی خوشی میں دیوانِ خاص میں قصیدہ پڑھ کر سنایا (۱۰) عبداللّطیف کے روزنامچے کے مطابق وہ ۱۲ مئی ۱۸۵۷ء کو صبح کے وقت ایوانِ شاہی میں آداب بجالانے کے لیے حاضر ہوئے اور ۱۱ اگست ۱۸۵۷ء کو بھی۔ جب ''نجم الدولہ نواب اسداللہ خان غالب نے ایک قصیدہ لکھ کر سنایا اور خلعت زیب تن کیا۔'' (۱۱) ۱۸ مئی ۱۸۵۷ء کو انگریزوں کے ایک جاسوس گوری شنکر کے روزنامچے میں بہادر شاہ ظفر کی تخت نشینی کا فارسی زبان میں ایک سکہّ غالب سے شاید غلط طور پر منسوب کیا گیا تھا۔ (۱۲) لیکن غالب نے دیر تک اس سکّے کے مقدّمے میں پیشیاں بھگتیں۔ وہ خود کہتا تھا کہ ''سکّے کا وار تو مجھ پر ایسا چلا جیسے کوئی چھرایا گراب، کس سے کہوں؟ کس کو گواہ ٹھہراؤں؟'' (۱۳) غالب اپنی صفائی کے لیے پریشان رہا اور بہادر شاہ ظفر کی پہلی تخت نشینی یعنی ۱۸۳۷ء، ۱۸۳۸ء کے زمانے کے اخبار تلاش کرتا پھرا۔ اسی دوران صاحب کمشنر نے اس کی فریاد سنی ان سنی کرتے ہوئے سزا کے طور پر پنشن موقوف کر دی۔ ادھر بہادر شاہ ظفر کے یہ اشعار بھی غالب کے ذہن میں محفوظ ہوں گے ؎

اے ظفرؔ! اب ہے تجھی تک انتظامِ سلطنت
بعد تیرے نے ولی عہدی نہ نامِ سلطنت

اور اس نے جب جنگِ آزادی کا علم اٹھایا تو اس خدشے کے ساتھ کہ ؎

اعتبارِ صبر و طاقت خاک میں رکھوں ظفرؔ
فوجِ ہندوستان نے کب ساتھ ٹیپو کا دیا

اور ایسا خدشہ صرف خدشہ ہی نہیں تلخ حقیقی تجربہ ثابت ہوا۔

بھیجا تھا میں نے اپنی طرف سے انھیں وہاں
وہ بھی تو جا کے ان کے طرف دار ہو گئے

کیا یہ جائے عبرت نہ تھی کہ اس سے غالب جیسا اپنے عہد کا باشعور ترین انسان فلسفۂ عملیت کا سبق نہ سیکھتا جو ''تاریخی مظاہر پر ان کے اسباب، ماسبق حالات اور نتائج کے اعتبار پر بحث کرنے والا'' ایک خود بین اور خود آراء شخص تھا (۱۴) کیا وہ حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے خود انگریزوں کے وظیفے کے محتاج خاندانِ تیموری کی بجائے اپنے نئے آقانِ ولی نعمت انگریز حکمرانوں کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش نہ کرتا جن کی وفاداری سے اس کی روزی کا تسلسل وابستہ تھا۔ جسے اگر چہ سقوط دہلی سے کچھ پہلے ''تباہیِ ریاست اودھ نے با آنکہ بیگانۂ محض'' ہوتے ہوئے بھی ''افسردہ دل کر دیا'' تھا اور یہ کہنے پر مجبور کر دیا کہ ''سخت ناانصاف ہیں وہ اہل ہند جو افسردہ دل نہ ہوئے ہوں گے۔ اللہ ہی اللہ ہے۔'' (۱۵) ایک اور خط میں کہتے ہیں: ''ہائے لکھنؤ، کچھ نہیں کھلتا کہ اس بہارستان پر کیا گزری'' (۱۶)

وہ جو اپنے خطوط میں ایک طویل عرصۂ جانکنی میں دکھائی دیتا ہے۔ وہ اس شہر کا مکیں ہے جو شہر نہیں ایک کیمپ رہ گیا ہے۔ جس میں غلہ مہنگا ہے، موت سستی ہے، ''جہاں قہر الٰہی ہے، منشا تباہی ہے'' (۱۷) رسن ہے، طوق ہے اور بے گناہوں کی گردنیں ہیں۔ عزیز و اقارب، یار دوست قتل ہو گئے تھے کہ جن سے گلے مل کر رو لیتے۔ اپنی جان بھی مہاراجہ پٹیالہ کے ساتھ انگریزوں کی اس مفاہمت کی وجہ سے بچ رہی تھی کہ وہ اس محلّے کی طرف نہیں آئیں گے جہاں ان کی قرابت داری تھی۔ یہ محض اتفاق تھا کہ غالب کا مکان بھی اسی محلّے میں تھا اور شاید مکان بھی مہاراجہ پٹیالہ کے کسی عزیز دوست کا تھا ورنہ تو غالب کے ساتھ بھی وہی کچھ ہو سکتا تھا جو غالب کے احباب اور عزیزوں کے ساتھ ہوا۔ وہ خود بتاتا ہے کہ اس کی آنکھوں کے سامنے ''ملازمینِ قلعہ پر شدت ہے۔ باز پرس اور دار و گیر میں مبتلا ہیں'' (۱۸)۔

چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے
گھر نمونہ بنا ہے زنداں کا (غالب)

شخصی رویے، میلانات اور رجحانات جامد یا ساکت نہیں متحرک اور فعّال ہوا کرتے ہیں۔ زندگی کے نشیب و فراز اور ذاتی تجربات رویوں کو تبدیل کرتے ہیں۔ تلخ اور سنگین واقعات انسانی نفسیات پر گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ ایسی ہولناک صورتِ حال غالب جیسے زندہ دل اور ملائم احساسات کے حامل شخص کو مایوسی اور قنوطیت کی دلدل میں دھکیلنے کے لیے کافی تھی۔ وہ آہو یعنی غالب چین سے کہیں آرمیدہ کیسے ہو سکتا تھا جس نے دشتِ غم یعنی دہلی میں اپنے صیاد بمعنی شکاری یعنی انگریز کو دیکھ لیا ہو لیکن یہ غالب ہی کا حوصلہ تھا کہ اس نے ان ہولناکیوں کو اپنی جان پر سہہ کر اپنے ہوش و حواس قائم رکھے۔

زمانہ سخت کم آزار ہے بجانِ اسدؔ
وگرنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہیں (دیوانِ غالب، نسخۂ حمیدیہ، ص۔۱۵۶)

o

تھی نو آموزِ فنا ہمّتِ دشوار پسند
سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا (دیوانِ غالب، نسخۂ حمیدیہ، ص۔۳۷)

اپنی مضبوط قوتِ ارادی اور عملیت پسندی کو بروئے کار لاتے ہوئے غالب نے زندگی کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے بلکہ اپنے لیے

نئے راستے نکالے۔

نام ہمارے بھی شامل ہیں پربت کاٹنے والوں میں
دیکھو ہم نے راہ نکالی بے ترتیب سوالوں میں (ثروت حسین)

قلزمِ خون کی اس شناوری کے دوران اور انگریزوں کے ڈر کے باوجود ایسا شعر غالب ہی کے قلم سے نکل سکتا تھا۔

تاب لاتے ہی بنے گی غالبؔ
واقعہ سخت ہے اور جانِ عزیز

غالب کے خطوط تو بے شمار ہیں جن میں اس نے اپنے دل کی بات کہی ہے لیکن غالب کی معاملہ فہمی اور اپنے مصائب و آرام کے گرداب سے نکلنے کے لیے حکمتِ عملی ایسی رہی کہ 'دستنبو' میں بھی ''تاریخ کو مسخ نہیں کیا۔ گوروں کی طرف سے معذرت خواہی کرتے ہوئے ہی سہی اس میں ان کے تمام مظالم بے کم و کاست بیان کر دیے گئے بلکہ کالوں سے زیادہ گوروں کے مظالم بیان کیے۔ اہل شہر کے زیادہ تر مصائب جو اس نے بیان کیے وہ انگریزوں کی فتحِ دہلی کے بعد کے ہیں۔'' یہ الگ بات کہ ''انھوں نے انگریزوں کے علم و دانش اور عدل و انصاف کی تعریف میں جا و بے جا جملے شامل کر دیئے ہیں۔'' (۱۹) دراصل غالب کو انگریزوں کی حمایت اپنے ہندوستانی مداحوں سے چھپانا تھی اور یہ دوگونہ احتیاط بھی اس کی عملیت پسندی کا مظہر تھی کہ 'دستنبو' کی ''۔۔۔۔۔عبارت فارسی بے آمیزش لفظِ عربی، فارسی قدیم کہ جس کا پارس کے بلاد میں بھی نشان نہیں ملتا تھا۔ بہند وستان چہ رسد۔۔۔'' اور دیکھیے کہ ساتھ ہی اپنے اصل مقصد کی طرف آ جاتے ہیں کہ جوان کے لیے زندگی موت کے مسئلے کی طرح ہے ''۔۔۔اہتمامِ انتظار یہی ہے کہ پنشن کا مقدمہ طے ہو چکے۔ ملے یا جواب ملے۔'' (۲۰) ملے یا جواب ملے جیسے بے ساختہ، مختصر مگر بلیغ جملے پر اختتام عملیت پسندی کی ایک اور گرہ کھول رہا ہے کہ عملیت ''فلسفے کا ایک غیر نظری نظام'' ہے ''جو خیالات کے عملی عواقب اور مفید نتائج کو ان کی راستی کی کسوٹی پر پرکھتا ہے اور جس کے نزدیک سچ بھی ایک طریقِ کار ہے۔'' (۲۱) حاتم علی بیگ مہر کو ایک خط میں غالب نے اپنے بارے میں کہا کہ ''جھوٹ بولنا میرا شعار نہیں۔'' (۲۲) غالب کو معلوم ہے کہ وقت ایک جگہ ٹھہرتا نہیں اور زندگی ایک مقام پر رکتی نہیں ع ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب!، جیسا متحرک مصرعہ کہنے والا کانٹوں سے بھرے بن میں رستے کی بنا ڈالنے کے لیے دو طرح کے سچ بول رہا ہے۔ ایک طرف تو وہ پنسنِ قدیم سے ہاتھ دھوئے بیٹھا ہے لیکن جواب پائے بغیر حاکم کی چوکھٹ سے کہیں اور جانا نہیں چاہتا۔ دربار و وظیفے کے لالے پڑے ہیں کہ جن پر زندگی کا دارومدار تھا۔ خلعت کا پتا نہیں کہ ملے نہ ملے کہ اس میں ایک اور پیچ آ پڑا ہے اور دوسری طرف وہ پرانے جاگیردارانہ نظام کی فرسودگی سے عاجز ہے۔ اس کا تاریخی شعور اسے خبردار کر رہا تھا کہ جس طرح ماضی میں حکومتوں کی تبدیلی سے رزق کے ذرائع بدل جاتے ہیں ویسے ہی ایک تو اب اسے اپنا رزق حال کے حکمرانوں کے حاصل کرنا ہے اور دوسری طرف جدید صنعتی نظام کے ارتقاء سے ہندوستانی سماج کے تعطل اور جمود کو توڑنے کی ضرورت ہے۔ انحطاط پذیر مغل حکومت کے احیاء کی اب کوئی امید باقی نہ رہی تھی پھر بھی ''وہ (یعنی معزول حاکم) اس کا امیدوار ہے کہ گیا ہوا پانی نہر میں واپس آ جائے'' (۲۳) ملک و ملّت کے لیے غالب کی یہ ذکاوت اور حق گوئی بے غرض تھی اور ایسی بے غرض سچائی بدنامی کا باعث بھی بنتی ہے۔ غالب کو بدنامی سہنا پڑی لیکن جہاں معین الدین حسن خان جیسے انگریزوں کے نمک خوار اور جیون لال جیسے وفادار مخبر ڈر کے مارے اپنے روزنامچوں اور خفیہ رپورٹوں میں پورا سچ نہ بول سکے وہاں شاہ کے وظیفہ خوار غالب جیسے آرام طلب تاریخی اعتبار سے پورا سچ کیسے بولتے۔ غالب نے تو پھر اپنے خطوط اور شاعری میں اپنا آدھا سچ مکمل کر دیا، باقیوں کو تو یہ توفیق بھی حاصل نہ تھی۔ سی۔ ایس۔ پیرس کی طرح اس نے شے کا معیارِ حقیقت صرف اور صرف اپنے اغراض و مقاصد سے تعلق کی بنا پر طے نہیں کیا۔ اس لیے غالب بیسویں صدی کے نصف اوّل میں عملیت پسندی پر حقیقت نگاروں اور مثالیت پسندوں کی تنقید کی زد سے نکل جاتا ہے۔ چاہے وہ

تاریخی واقعات کو ان کے عملی سبق اور افادے کو سامنے رکھ کر بیان کرنے والا کوئی عملیت پسند ہی کیوں نہ ہو۔ دراصل غالب کی عملیت پسندی انسانی فطرت کے ایک جزو کے طور پر اس میں پائی جاتی تھی جو حالات کے تقاضوں کے پیشِ نظر خود بخود ظاہر ہو جاتی ہے۔ اسے معاشرہ محض دنیاداری نہیں بلکہ تاریخی شعور اور دانش مندی کے طور پر بھی قبول کر لیتا ہے۔ ولیم جیمز تو یہاں تک کہتا ہے :

" a belief or theory is true in so far as it 'works' and ' pays'." (۲۴)

وہ انسان کے مزاج اور رویے کے لیے مفید اور نتیجہ خیز اثرات کی خاطر کسی ابہام کی وضاحت اور تفہیم کو روا جانتا ہے بلکہ اپنے بارے میں شبہات اور الزامات سے بری ہونے کے لیے ہر طرح سے دفاع کو جائز سمجھتا ہے۔ غالب کا اپنا مقدمہ لڑنا اس کا حق تھا۔ اس نے جتنے بھی اقدامات اٹھائے، قانون کے دائرے میں رہ کر اٹھائے اور اپنی برأت ثابت کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ اس کا کہنا تھا کہ ''دولت کا ہاتھ آنا مع نیک نامی، اس سے بہتر دنیا میں کوئی بات نہیں'' (۲۵) یعنی وہ ولیم جیمز کی طرح مذہب اور مسلّمہ اخلاقیات کے دائرے میں رہتے ہوئے اپنے مفاد کے حصول کا قائل تھا۔ اس کی حاتم علی مہر کو یہ نصیحت کہ ''مصری کی مکھی بنو، شہد کی مکھی نہ بنو'' (۲۶) بھی اس کی اسی عملیت پسندی کا ایک پہلو ہے یعنی ایسا کام نہ کرو جس میں پھنس کر رہ جاؤ۔ غالب کا یہ رویّہ اس کی اپنی ذہنی کیفیت کا عکاس ہے جو اس کی سماجی آموزش سے تشکیل پایا ہے۔

بالآخر یہی ہوا کہ غالب کے مسائل حل ہوئے مگر ۱۸۵۷ء کے تین سال بعد بھی جزوی طور پر حل ہوئے اور ''اس کے دل و دماغ پر پنشن کے حصول کے مسائل اور ادائے قرض کا بوجھ تا دمِ مرگ رہا۔'' (۲۷) ''غالب کی محدود پنشن اور دربار کی بحالی میں بھی سر سید احمد خان کی کوششوں کا دخل تھا۔'' (۲۸) اور بالآخر دستنبو کی اشاعت کے دو مقاصد جن کا ذکر ابتداء میں ہوا یعنی 'ذاتی تحفظ' بذریعہ پنشن اور 'فروغِ مراتب'، پورے ہوئے۔ 'دستنبو' کے آخر میں غالب کی اپنی زبان میں اس کتاب کے مقاصد خطاب و خلعت اور پنشن کے اجراء کا حکم تھے۔ (۲۹) ایک جگہ غالب نے دربار، خلعت اور پنسن لکھا ہے۔ آخر کار غالب خود اپنے بارے میں کہہ پایا کہ ''یہ گوشہ نشین سرکارِ فیض آثار انگریزی کا بعوض جاگیر پنسن دار اور گورنمنٹ کے دربار میں سات پارچہ اور تین رقم خلعت پانے والا اور حضرت قدرِ قدرت ملکہ معظمۂ دوراں کا مداح اور بقلم وزرائے شہنشاہی سارٹی فکیٹ خوشنودی کا پائے ہوئے۔'' (۳۰) یعنی کسی قدر بے اصول عملیت پسندی کی مظہر 'دستنبو' جیسی پراپیگنڈا دستاویز اور ملکۂ وکٹوریہ اور انگریز افسران کے قصیدے بھی کام آئے۔ نیز تحسین و تائیدِ سرکار انگریزی میں اودھ اخبار لکھنؤ کے ۲۳ اپریل ۱۸۶۲ء صفحہ ۲۸۱ پر شائع شدہ مندرجہ ذیل بیان بھی بروئے کار آیا:

''ملک سراسر بے خس و خار ہو گیا ہے۔ قلمرو ہند نمونۂ گلزار ہو گیا ہے۔ بہشت اور بیکنٹھ جو مرنے کے بعد متصور تھا اب زندگی میں موجود ہے۔ وہ احمق ہے، وہ ناقدر دان ہے جو انگریزی عمل داری میں ناخوشنود ہے۔'' (۳۱) یہ دراصل ایک نثر پارے کا اقتباس ہے جس میں غالب نے ایک بار پھر حاکم و محکوم کی باہمی خیر اندیشی کے خیال سے سستے اناج، اگن بوٹ، ریل گاڑی، مدرسوں کی رونق اور رواجِ علم کی کثرت کا ذکر کیا ہے۔ دیکھا جائے تو غالب کی پہچان ملک الشعراء اور استادِ شاہ کی تھی۔ وہ کوئی سرکاری وقائع نگار یا باقاعدہ مورخ تھا نہ ہی کوئی سیاست دان کہ ایسے معاملات میں اپنی رائے کا اظہار کرتا۔ (تیموروں کی جس تاریخ کا منصوبہ اسے چھ سو روپے میں تفویض کیا تھا وہ اسے شاید کبھی نہ لکھ پایا تھا)۔ 'دستنبو' میں قدیم فارسی کے استعمال سے انگریزوں کی حمایت کی پردہ پوشی بھی اس کا ایک اور مقصد یا نتیجہ تھا جسے وہ حاصل کرنے میں کامیاب رہا۔ یہ ایک دخل در معقولات اور ضرورت سے زیادہ عملیت پسندانہ مستعدی بھی تھی جو مالی مسائل کے حل کے لیے اس نے کی تھی۔ عجیب بات یہ ہے کہ ایسی غیر استدلالی دخل اندازی بھی عملیت پسندوں کے ہاں پائی جاتی ہے البتہ غالب واضح طور پر اپنے اس فعل پر اپنے ہم وطنوں کے سامنے شرمساری سے بچنے کی کوشش بھی کر رہا تھا یعنی وہ اپنی عملیت پسندی کے مطلوبہ نتائج پانا تو چاہتا تھا لیکن ان نتائج کے منفی

اثرات سے بچنا بھی چاہتا تھا۔ غالب کا یہ رویہ بھی معاشرے کے لئے قابلِ قبول رہنے کے مسلّمہ انسانی رویّوں کے مطابق ہے۔ اسے اصطلاحاً تطبیقی وظیفہ (Adaptive Function) کہا جاتا ہے۔ بدلتے ہوئے پیچیدہ حالات سے مطابقت پیدا کرنے کے لیے ہی غالب کی نتائجیت پسندی کبھی بھی نتائجیت پرستی کی حدود تک پہنچ کر اس پر حاوی نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے اس کا ضمیر مکمل طور پر مطمئن نہیں ہوتا اور وہ اپنی شاعری اور خطوط میں اپنی اس نامکمل رائے کو مکمل کرتا ہے۔ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی تو سکّۂ شعر کے قصے میں بھی یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ غالب نے سکّۂ شعر نہیں کہا تھا چاہے غالب اس سے انکار کرتا رہے۔ سکۂ شعر البتہ گوری شنکر کے درج کیے ہوئے سکّۂ شعر سے مختلف ہوسکتا ہے۔ احمد فاروقی کے خیال میں اصل سکّہ یوں ہے ؎

بر زرِ آفتاب و نقرۂ ماہ
سکّہ درزد در جہاں بہادر شاہ

''جو خود پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ اس کا مصنف غالب کے سوا دوسرا نہیں ہوسکتا'' (۳۲)۔ وہ اس شعر کو غالب کے انکار کی بنیاد نہیں سمجھتے جو دراصل ویرانؔ کا لکھا ہوا ہے اور اس لیے خواجہ احمد فاروقی کے بقول ''غالب کے باغیوں کے ساتھ اخلاص کی بات بالکل نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہے''۔ (۳۳)

نواب یوسف مرزا کے نام جون، جولائی ۱۸۵۸ء کے دوران اور خاص طور پر ملکہ معظّمہ کی طرف سے باغیوں کے لیے عام معافی کے اعلان کے بعد غالب کے ایک خط سے تو غالب کی تمام تر احتیاط کے باوصف اصل حقیقت سے پردہ اٹھ جاتا ہے: ''میں نے سکّہ کہا نہیں اور اگر کہا تو اپنی جان اور حرمت بچانے کو کہا۔ یہ گناہ نہیں اور اگر گناہ بھی ہے تو کیا ایسا سنگین ہے کہ ملکہ معظّمہ کا اشتہار بھی اس کو مٹا نہ سکے؟ سبحان اللہ، گولہ انداز کا بارود بنانا اور توپیں لگانی اور بنک گھر اور میگزین کا لوٹنا معاف ہوجائے اور شاعر کے دو مصرعے معاف نہ ہوں۔'' (۳۴) انگریز حکومت کو البتہ غالب کی معاملہ فہمی کے سبب اس کے لکھے ہوئے اصل سکّے کا علم نہ ہوسکا تھا۔ یہ خط محققین کی توجہ غالب کے شخصی ادراک کی تعلیل (Attribution) کی طرف مبذول کرواتا ہے۔ غالب کو سمجھنے کے لئے اس کے کردار اور اعمال کے پیچھے کارفرما ارادوں اور وجوہات کا استخراج بھی ضروری ہے۔

یعنی غالب نے سکہ کہا تھا تاکہ شورش پسندوں سے جان اور حرمت بچا سکے لیکن انگریزوں کی فتح کے باعث اُن کے عتاب سے بچنے کے لیے پہلے تو انکار کرتا رہا اور جب معافی کا اعلان ہوا تو نیمے دروں نیمے بروں سکّۂ شعر تحریر کرنے کا اعتراف بھی کرلیا۔ لیکن اب بھی باغیوں سے واضح ہمدردی سے گریز اس کی عملیت پسندی کا شاخسانہ ہے۔ ذرا سوچیے کہ اگر انگریزوں کے ہاتھ غالب کے وہ خطوط لگ جاتے جو اس نے اپنے قابلِ اعتماد عزیزوں اور دوستوں کو لکھے تھے تو انگریز اس کا کیا حشر کرتے۔ خاص طور پر وہ خط جس میں اس نے انگریزوں کو بندر کہا ہوا ہے۔ یعنی جو دل کی بات تھی وہ تو غالب نے اپنوں سے کہی اور جو کچھ اس نے 'دستنبو' میں لکھا اور درخواستوں اور ان سے ہمرشتہ قصیدوں میں کہا، وہ اس کے دل کی آواز نہ تھی۔ جانے اپنے دل پر کتنے وزنی پتھر رکھ کر وہ ایسا کرتا رہا، اور اپنے آپ سے شرمندہ ہوتا رہا۔

ذمّہ دار محققین جانتے ہیں کہ روزنامچے، خطوط اور یادداشتیں تحقیقی اصولوں کے مطابق مستند ترین حوالہ جات تسلیم کئے جاتے ہیں اور ایسے حوالہ جات کی تلاش کسی محقق کا کارنامہ سمجھا جاتا ہے لیکن ایسے حوالے بھی صرف اسی صورت میں مستند ہوتے ہیں جب کوئی تحریر کرنے والا انھیں بغرضِ اشاعت تحریر نہ کر رہا ہو جبکہ 'دستنبو' نہ صرف اشاعت بلکہ مخصوص ذاتی اغراض کے لئے لکھا گیا روزنامچہ ہے۔ اس لئے اس کی کوئی تاریخی اہمیت نہیں ہے جب تک کہ اس میں درج واقعات کی دوسرے مستند حوالوں سے تصدیق نہ کرلی جائے۔ اس روزنامچے کے مقابلے میں غالب کے خطوط بہت حد تک مستند حوالے کے طور پر استعمال کئے جاسکتے ہیں۔ اگرچہ ان میں بھی غالب نے ان معاملات میں احتیاط سے کام لیا

ہے جو اس کی الجھنیں بڑھا سکتے تھے۔ غالب کے خطوط میں اس امر کے اشارے بھی موجود ہیں کہ انھیں کبھی شائع بھی کیا جا سکتا ہے۔

۱۸۵۷ء سے بھی پہلے اور جنگِ آزادی کے دوران یعنی آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے ایک عظیم کھیل (Great Game) کا آغاز ہوا تھا جس کا مقصد روس کی بحیرۂ عرب کے گرم پانیوں کی طرف پیش قدمی اور وسط ایشیا پر بالادستی کو روکنا تھا۔ دراصل انیسویں صدی کے ایک یورپی امیرالبحر ماہان نے بحرِ ہند کو دنیا کے تمام سمندروں اور ان کے ذریعے دنیا پر حکمرانی کی کنجی قرار دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایک استعماری طاقت دوسری عالمی طاقت کے عزائم سے غافل کس طرح رہ سکتی ہے۔ یہاں بھی غالب نے از حد احتیاط پسندی سے کام لیا ہے۔ ''(اب) سننے کے لیے جو خوش خبری (ہے) وہ روسیوں کی خسروِ ایران کے ساتھ دوستی اور ان دونوں گروہوں کا (مل کر) عازمِ ہندوستان ہونا ہے۔ چونکہ یہ افواہیں پریوں کی کہانی سے زیادہ نہیں ہیں۔ (اس لیے) زیادہ عقلمند وہی ہے کہ یہ باتیں زبان پر نہ لائے اور ان خبروں پر اعتبار نہ کرے۔ زمانے کے سرد و گرم کا ہنگامہ ایک طرف اور بادشاہوں کی صلح و جنگ کی افواہیں اپنی جگہ۔'' (۳۵) خوش خبری کا لفظ اور ایسی خوش خبری کے محض افواہ ہونے کا تاسّف بھی اس اقتباس میں کمزور سی ہی سہی ایک زیریں لہر کی طرح موجود ہے۔ محققین کا خیال ہے کہ یہ خط ۱۸۴۱ء تا ۱۸۴۳ء کے درمیان لکھا گیا اور اودھ اخبار کے ۲۳ اپریل ۱۸۶۲ء میں غالب کے جس مضمون کا حوالہ پہلے آ چکا ہے اس میں بھی کابل کے اخبار پر رغبت سے کان دھرنے پر غالب نے اہلِ ہندوستان کے سامنے اگلے فتنہ و فساد، وبا و قحط یاد دلا کر انھیں حکمرانوں کی مہربانیاں گنوائی ہیں۔ امر یکہ شاید انیسویں صدی کے آخر میں اس عظیم کھیل کا حصّہ بنا جس کا اشارہ ایک انگریز صحافی کے ۱۸۸۰ء کے بیان سے ملتا ہے۔ درمیان میں ۱۸۵۷ء آن پڑتا ہے جس کے نتیجے میں بہادر شاہ ظفر معزول ہوا۔ اس کے خلاف مقدّمے میں ایک الزام بطور مغل بادشاہ اس کے ایرانی شاہ کے لیے شاہ نجف کو بطور ایلچی بھیجنا بھی تھا تاکہ وہ جنگِ آزادی میں مغل بادشاہ کی مدد کرے۔ اس سلسلے میں ۲۷ جنوری ۱۸۵۸ء کو توپ خانے کے لیفٹیننٹ کرنل ڈلرس کی فوجی عدالت میں ریذیڈنٹ دہلی سر تھامس تھیوفلس مٹکاف، مخبر چنی لال اور کشن سنگھ، چپراسی مدیر اخبار دہلی پر جرح کی تفصیل بھی کتابوں میں درج ہے (۳۶) لیکن تاریخ کے اتار چڑھاؤ اور آئندہ حالات کی پیش بینی اور پیش بندی میں غالب کی ذہنی مستعدی اور باخبری کا اندازہ اس سے لگائیے کہ غالب نے انقلابِ ستاون سے چودہ پندرہ برس قبل اور ۱۸۸۰ء سے چالیس سال قبل اس عظیم کھیل کے داؤ پیچ کا ذکر واضح طور پر کر دیا تھا یعنی عملی عواقب، تاریخی حالات اور اقدار کے اس قدر گہرے شعور سے بھی غالب روشنی حاصل کیا کرتا تھا۔ یہ رویہ عملیت پسندی کی روح کے عین مطابق ہے۔ ادھر برطانوی استعمار نے بھی جنگِ آزادی سے سبق سیکھا تھا اور اس نے بھی اپنی اصلاح سرسید اور غالب کی تحریروں کی روشنی میں شروع کر دی تھی یعنی وہ بھی عملیت پسند ہو رہے تھے تاکہ اگر روس حملہ کرے تو ایران اس کا ساتھ نہ دے اور نامطمئن ہندوستانی خاص طور پر مسلمان ان کے ساتھ نہ مل جائیں۔

یہ بھی ممکن تھا کہ مصائب کی پیہم یلغار، داروگیر اور ذاتی صدموں کے ہاتھوں پریشان حال غالب شکست تسلیم کر لیتا۔ خوف، ہیجان، جھنجھلاہٹ، تشویش اور دباؤ، اس کی نفسیات بدل دیتے اور وہ اپنے مسائل سے فرار اختیار کر لیتا جیسا کہ اکثر لوگوں سے ایسے نامساعد حالات میں ہو جاتا ہے۔ زندگی کے تلخ حقائق سے بچنے کے لیے کبوتر کی طرح آنکھ بند کر کے غیر حقیقی اور ماورائی تصورات میں پناہ تلاش کرنے کے رجحان کو فراریت (Escapism) اور ایسی تحریروں کو فراری ادب (Escape Leterature) کہا جاتا ہے۔ ایسے ادب کو عملیت پسندی کے متضاد بھی خیال کیا جا سکتا ہے۔ بایں ہمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فراری ادیب زندگی کے بہاؤ کے خلاف نہیں بلکہ زندگی کی طرف ہمک رہا ہو کہ آخر وہ انسانی کرب بھی عین زندگی ہی تو ہے جو آزاروں اور حادثات سے پیدا ہوتا ہے اور تخلیقیت کو مہمیز کرتا ہے ؎

ہوں گرمیِ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں (دیوان غالب، نسخۂ حمیدیہ، حاشیہ، ص۔ ۱۴۸۔)

غالب ان ناگفتہ بہ اور دگرگوں حالات میں بھی فرار نہیں ہوا۔ وہ اپنی دستار سنبھالے ہوئے ہے۔ جاگیر کا وارث، نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ، استادِ شاہ جیسے خطابات، سات پارچے خلعت یافتہ، پچاس روپے مہینہ کے علاوہ چار سو روپے سال اور جاگیر سے ملنے والی سالانہ پنشن پانے والا یہ کہنے پر مجبور تو ہے کہ ''اب یوں سمجھو کہ نہ ہم کبھی کہیں کے رئیس تھے، نہ جاہ وحشم رکھتے تھے، نہ املاک تھے نہ پنشن رکھتے تھے۔'' (۳۷) لیکن حوصلہ بہم تھا کہ اپنے حالات بدلنے کی جدوجہد جاری رکھی جب تک کہ قویٰ مضمحل نہ ہو گئے۔ ڈر ہے تو صرف یہ کہ کہیں بے وفائی اور نمک حرامی کا دھبہ نہ لگ جائے۔ معرضِ باز پرس ہونا نہ ہونا دوسری بات ہے لیکن غالب نے واضح طور پر خود بتایا کہ:

'' اب تک جیتا ہوں، بھاگ نہیں گیا۔'' (۳۸)

'' فراری نہیں ہوں، روپوش نہیں ہوں۔'' (۳۹)

'' میں مخفی نہیں ہوں روپوش نہیں ہوں۔'' (۴۰)

لاکھ خوف ہو کہ انجام کار کیا ہوگا؟ بری آ بنی ہے؟ زندگی وبال ہے؟ جان کے لالے پڑے ہیں؟ لیکن فراریت سے اجتناب ہے اور اگر پنشن بھی درکار ہے تو وہ بھی گزارے موافق نہیں البتہ اس کی فکر اس لیے ہے کہ صفائی اور بے گناہی کی دلیل ہے۔ یعنی غالب نے حالات سے فرار کی بجائے حالات کا جوانمردی سے سامنا کرنے کا ارادہ کیا اور پھر اس پر تادم مرگ قائم رہا۔ اس کی عملیت پسندی سے اس کی مصیبتوں کا جزوی سہی مگر کسی حد تک ازالہ ہو گیا تھا۔

غالب عرش سے پرے اپنے مکاں کی حسرت میں دشتِ امکان کو ایک نقش پا سمجھتا تو ہے لیکن شاعر ہونا اس کی شخصیت کا ایک پہلو ہے۔ شاعر معاشرے کا ایک کارآمد فرد بھی ہوتا ہے یا نہیں ہوتا تو ہونا چاہیے۔ اسے اپنی معاشرتی ذمہ داروں کا ادراک ہی نہیں ہوتا بلکہ انھیں بخوبی ادا کرنے کی لیاقت اور اہلیت بھی درکار ہوتی ہے۔ غالب کی عملیت پسندی مشکل حالات سے سرخرو ہو کر نکلنے کی کوشش میں مضمر ہے ورنہ باقاعدہ انقلابیوں نے تو موت کے خوف سے اپنے نام، نسب اور پیشے تک بدل ڈالے۔ بھیس بدلنا تو معمولی بات ہے۔ نازک زمانے اور مہلک شورش کے ہلاکت خیز نتائج سے بچنے کے لیے کچھ انگریزوں ہی کے جاسوس بن گئے اور بعض نے تو باقاعدہ سازش سے جنگِ آزادی کو ناکام بنایا۔ ایسے مشکوک اور بے اصول کرداروں کے مقابلے میں غالب کی ذات اور شخصیت میں تضاد کم سے کم ہے اور مستقل مزاجی کا عنصر زیادہ نمایاں ہے۔ وہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے دوران گھر میں اس طرح بند نہیں ہوا جس طرح سمجھا جاتا ہے۔ غالب کی اپنی احتیاط پسندی بھی اس کے بارے میں بعض غلط فہمیاں پھیلانے کا موجب بنی ہے اور یہ عملیت جنگِ آزادی کے نتائج کی دین ہے حالانکہ ان خوں فشاں واقعات کے دوران بھی غالب نے اپنی وضع داری نبھانے کی کوشش کی ہے۔ اگر اس نے حقیقتِ حال کا ادراک کر کے عملیت پسندی کا مظاہرہ بھی کیا تو حکمرانوں کے در نیاز پر جبینِ نیاز اس قدر نہیں ٹیکی جس قدر اس دور کے دوسرے زعما اور اہلِ علم نے اپنی جگ ہنسائی کروائی۔ اگر کسی انگریز نے اس کے حق کے راستے میں روڑے اٹکائے تو اس نے اس کی مذمت میں قدح بھی لکھی ہے۔ بہرحال غالب کے بارے میں آخری فیصلہ اس پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹنے اور ان کا سامنا کرنے کے حوالے سے نہیں اس کی شاعری کے بل پر ہوا ہے اور جدّت طرازی، فکر انگیزی، معاملہ بندی، حقیقت پسندانہ وارداتِ جمال، شعور کی کارفرمائی اور فنی گرفت کی بنا پر غالب کی شاعری لازوال ہے اور لازوال رہے گی۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ (ڈاکٹر) سید معین الرحمٰن: غالب اور انقلاب ستاون، الفیصل، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص۔ ۳۰۔

۲۔ ایضاً: ص۔ ۱۸۔

۳۔ غالب: خط بنام مرزا ہرگوپال تفتہ مشمولہ، خطوطِ غالب، مرتبہ: غلام رسول مہر، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۸۲ء، ص۔۱۳۶۔

۴۔ محمد اسداللہ خان (غالب): درخواست بنام معتمد سیاسی برائے حکومت مورخہ ۲۸ جولائی ۱۸۳۰ء مشمولہ غالب کی خاندانی پنشن۔ یگرامور، مرتبہ: ڈاکٹر گوہر نوشاہی، نیشنل ڈاکومنٹیشن سنٹر و مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۴ء، ص۔۷۷ (اردو) ص۔۷۰ (انگریزی)۔

۵۔ انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا، جلد۔۱۸۔ ولیم بینٹن، لندن، ۱۹۶۷ء، ص۔۴۲۴۔

۶۔ خواجہ منظور حسین مشمولہ غالب اور انقلابِ ستاون از ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، مذکور، ص۔۱۸۔

۷۔ خالد امین: غالب، تحریک مجاہدین اور ۱۸۵۷ء مشمولہ صحیفہ، کتاب ۱۸۵۷ء، مرتبہ: رفاقت علی شاہد، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص۔۱۳۱۔

۸۔ آئینِ اکبری پر غالب کی تقریظ کے مکمل اردو ترجمے کے لیے دیکھئے غالب کے زمانے کی دلّی از ڈاکٹر عباس برمانی، سنگِ میل، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص۔۱۷۳۔

۹۔ غالب: مکتوب بنام چوہدری عبدالغفور سرور، مرقومہ ستمبر ۱۸۵۹ء مشمولہ، غالب کے خطوط جلد دوم مرتبہ: خلیق انجم، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۸۹ء، ص۔۶۰۳۔

۱۰۔ روزنامچہ جیون لال ۱۳ جولائی ۱۸۵۷ء مشمولہ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء۔ دو خفیہ روزنامچے، مترجم ضیاء الدین برنی، تخلیقات، لاہور، ۱۹۹۹ء، ص۔۱۵۷۔ کہا جاتا ہے کہ غالب نے ملکہ وکٹوریہ کے لیے جو قصیدہ لکھا تھا وہ دراصل چند سال پہلے بہادر شاہ ظفر کے لیے لکھا گیا تھا۔ کیا خبر یہ وہی قصیدہ ہو۔

۱۱۔ بحوالہ غالب اور انقلابِ ستاون از ڈاکٹر سید معین الرحمٰن مذکور، ص۔۴۶۔

۱۲۔ بحوالہ غالب اور انقلابِ ستاون مذکور، ص۔۱۸۶۔ غالب شناس دیر تک اس بارے میں تحقیق کرتے رہے اور اب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ یہ سکّہ مرزا غالب کا نہیں تھا بلکہ ذوق کے شاگرد حافظ غلام رسول ویراں کا تھا اور صادق الاخبار دہلی کے ۶ جولائی ۱۸۵۷ء کے شمارے میں چھپا تھا۔

۱۳۔ غالب: مکتوب بنام صاحب عالم مارہروی (۱۸۵۹ء) مشمولہ، خطوطِ غالب، مرتبہ: غلام رسول مہر، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۸۲ء، ص۔۴۲۸۔ اسی کتاب کے حوالے سے غالب کا مذکورہ خط ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے صاحب عالم مارہروی سے منسوب کیا ہے لیکن یہی خط غالب کے خطوط، جلد دوم، مرتبہ خلیق انجم میں چوہدری عبدالغفور سرور کے نام خطوط میں شامل ہے۔ ص۔۶۰۲ تا ۶۰۵۔

۱۴۔ قومی انگریزی۔ اردو لغت: مرتبہ: ڈاکٹر جمیل جالبی، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۰۰ء، ص۔۱۵۳۳۔

۱۵۔ غالب: مکتوب بنام قدر بلگرامی مرقومہ ۲۳ فروری ۱۸۵۷ء، مشمولہ خطوطِ غالب مرتبہ: غلام رسول مہر مذکور، ص۔۴۶۰۔

۱۶۔ غالب: خط بنام حاتم علی بیگ مہر، مشمولہ خطوطِ غالب مرتبہ: غلام رسول مہر مذکور، ص۔۱۸۰۔

۱۷۔ غالب: مکتوب بنام انوار الدولہ سعد الدین خان بہادر شفق مشمولہ غالب کی نادر تحریریں، مرتبہ: خلیق انجم، مکتبۂ شاہراہ، دہلی۔ ۱۹۶۱ء، ص۔۳۲۔

۱۸۔ غالب: مکتوب بنام ہرگوپال تفتہ، مشمولہ غالب کے خطوط، جلد اوّل، مرتبہ: خلیق انجم، انجمن ترقی اردو، پاکستان

کراچی، ۱۹۸۹ء، ص۔۲۶۷۔

۱۹۔ (ڈاکٹر) عباس برمانی: غالب کے زمانے کی دلّی، مذکور، ص۔۲۰۱۔

۲۰۔ غالب: مکتوب بنام نامعلوم مشمولہ غالب کی نادر تحریریں، مرتبہ: خلیق انجم مذکور، ص۔۳۴۔

۲۱۔ قومی انگریزی۔اردو لغت مذکور، ص۔۱۵۳۳۔

۲۲۔ غالب: خط بنام حاتم علی بیگ مہر مشمولہ خطوطِ غالب: مرتبہ غلام رسول مہر مذکور، ص۔۱۸۱۔

۲۳۔ غالب: مکتوب بنام مولوی سراج الدین احمد مشمولہ غالب کے منتخب فارسی مکتوبات، مرتّب و مترجم: پرتو روہیلہ، ناشر: پرتو روہیلہ، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء، ص۔۶۹۔

۲۴۔ انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا، جلد۔۱۸ مذکور، ص۔۴۲۵۔

۲۵۔ غالب: خط بنام حاتم علی بیگ مہر مشمولہ خطوطِ غالب، مرتبہ: غلام رسول مہر مذکور، ص۔۱۸۲۔

۲۶۔ غالب: خط بنام حاتم علی بیگ مہر مشمولہ عود ہندی، نولکشور لکھنؤ، س۔ن۔، ص۔۱۶۶۔

۲۷۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی: غالب کی خاندانی پنشن و دیگر امور، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۷ء، ص۔۱۲۔

۲۸۔ یادگارِ غالب از حالی اور مرزا غالب از تتالیہ پریگارینا بحوالہ غالب کے زمانے کی دلّی از ڈاکٹر عباس برمانی مذکور، ص۔۱۷۵۔

۲۹۔ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن: غالب اور انقلابِ ستاون مذکور، ص۔۱۶۸۔

۳۰۔ غالب: مکتوب بنام مہاراجہ سردار سنگھ والیٔ بیکانیر مشمولہ غالب کی نادر تحریریں مرتبہ: ڈاکٹر خلیق انجم مذکور، ص۔۳۶۔

۳۱۔ اودھ اخبار شمارہ ۲۳ اپریل ۱۸۶۲ء بحوالہ غالب اور انقلابِ ستاون از ڈاکٹر سید معین الرحمٰن مذکور، ضمیمہ سوم۔ یہی مضمون نقوش، لاہور شمارہ ۱۱۱، غالب نمبر، فروری ۱۹۶۹ء اور غالب کے زمانے کی دلّی از ڈاکٹر عباس برمانی مذکور صفحہ نمبر ۱۹۷۔۱۹۶ پر بھی درج ہے۔

۳۲۔ (ڈاکٹر) خواجہ احمد فاروقی: غالب کا سکّۂ شعر، مشمولہ صحیفہ، کتابِ غالب۔۱ مرتبہ: ڈاکٹر وحید قریشی، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۲۷۲

۳۳۔ ایضاً: ص۔۲۷۰

۳۴۔ غالب: خط بنام نواب یوسف مرزا، مشمولہ غالب کے خطوط، حصہ دوم، مرتبہ: خلیق انجم مذکور، ص۔۶۹۔

۳۵۔ غالب: مکتوب بنام نواب مصطفےٰ خان بہادر مشمولہ غالب کے منتخب فارسی خطوط، مرتّب و مترجم: پرتو روہیلہ مذکور، ص۔۳۹۔

۳۶۔ (ڈاکٹر) عباس برمانی: غالب کے زمانے کی دلی مذکور، ص۔۱۹۶۔۱۹۹، بحوالہ چراغِ دہلی از مرزا حیرت دہلوی، کرزن پریس، دہلی۔

۳۷۔ غالب: مکتوب بنام نواب حسین مرزا مرقومہ ۳۱ دسمبر ۱۸۵۹ء مشمولہ غالب کے خطوط، جلد اوّل، مرتبہ: خلیق انجم مذکور، ص۔۶۸۲۔

۳۸۔ غالب: مکتوب بنام حکیم غلام نجف خان، مرقومہ ۲۱ دسمبر ۱۸۶۲ء، ایضاً، ص۔۶۲۳۔

۳۹۔ غالب: مکتوب بنام ہرگوپال تفتہ، مرقومہ ۳۱ جنوری ۱۸۵۸ء، مشمولہ غالب کے خطوط، جلد دوم، مرتبہ: خلیق انجم مذکور، ص۔۲۶۸۔

۴۰۔ غالب: مکتوب بنام میر مہدی مجروح، مرقومہ ۷ فروری ۱۸۵۸ء، مشمولہ غالب کے خطوط، جلد دوم، مرتبہ: خلیق انجم مذکور، ص۔۱۹۲۔